مولانا نعیم الدین اصلاحی

قرآن کے بعض اسالیب سے متعلق مولانا فراہیؒ کی توضیحات

(ایک مُطالعہ)

علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اپنی علمی اور فکری کاوشوں سے مختلف علوم وفنون میں نہایت قیمتی اضافہ فرمایا ہے۔ علم تفسیر، علم لغت اور علم نحو اور بلاغت کے سلسلے میں ان کا علمی اور فکری سرمایہ جو ہمارے سامنے موجود ہے، مختصر ہونے کے باوجود بہت ہی وقیع اور گراں قدر ہے۔

مولانا ویسے تو علوم قدیمہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور تھے مگر انھوں نے انہی علوم وفنون کو اپنی تحقیق وجستجو کا مرکز ومحور بنایا جن کا تعلق قرآنی علوم سے تھا۔

قرآن مجید کا علم عام ہو، اس کی بلاغت اور اس کے مخصوص اسالیب کی اس انداز سے وضاحت ہو کہ اس کتاب کی زندہ اور متحرک تصویر سامنے آجائے، اس کے لیے مولانا نے 'جمہرۃ البلاغۃ' اور 'اسالیب القرآن' وغیرہ جیسی کتابیں لکھیں، جو مختصر ہونے کے باوجود نہایت اہم ہیں۔ ان کتابوں سے زبان وادب، بلاغت اور اسلوبِ قرآن کے بہت سے حیرت انگیز گو۔شے سامنے آجاتے ہیں۔

یہاں علم بلاغت، فن لغت اور اسلوبِ قرآنی کے سلسلے میں مولانا فراہیؒ کے افکار وخیالات کا احاطہ مقصود نہیں ہے۔ اس مختصر سے مقالہ میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے مولانا کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

'اسالیب القرآن' مولانا کی ایک مختصر سی تصنیف ہے لیکن اس میں انھوں نے بڑی اہم باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو قرآن مجید کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ مولانا کی رائے کس قدر ٹھوس، مدلّل، واضح اور موقع و محل کے اعتبار سے انسب ہے۔

۱۔ واو عاطفہ

'اسالیب القرآن' کی ایک اہم بحث 'واو عاطفہ' کی ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ 'واو عاطفہ' بیانیہ بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر علمار لغت اور ائمہ نحو 'واو' کو بیانیہ نہیں مانتے حالانکہ کلام عرب اور قرآن مجید دونوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

وقل لهم بادروا بالعذر والتمسوا
قولا يبرئكم انی انا الموت

ان سے کہو: "جلد از جلد معذرت پیش کرو، یعنی کوئی ایسی بات تلاش کرو جو تمھیں بے گناہ ثابت کرے۔ ورنہ میں موت ہوں۔ تمھاری خیریت نہیں ہے۔"

علامہ فراہیؒ نے سورۂ توبہ سے 'واو بیانیہ' کی ایک مثال پیش کی ہے:

"واذا انزلت سورة ان آمنوا بالله وجاهدوا مع رسوله استأذنك اولوا الطول منهم وقالوا ذرنا نكن مع القاعدين۔"
(سورۃ التوبہ آیت ۸۶)

بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں ایمان باللہ اور جہاد دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسی طرح رسول اللہؐ سے منافقین کی اجازت طلبی اور جنگ میں عدم شرکت کی درخواست، الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ علامہ شوکانی 'ایمان باللہ' اور جہاد کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

انما قدم الأمر بالايمان	جہاد سے پہلے ایمان باللہ کا حکم اس لیے
بالله لان الاشتغال بالجهاد	دیا گیا ہے کہ بغیر ایمان کے جہاد کرنا
لايفيد الابعد الايمان۔	بے معنی ہے۔

مگر مولانا فراہی کہتے ہیں کہ آیت کریمہ میں وجاهدوا ان آمنوا بالله کی تفسیر ہے۔ اسی

طرح وقالوا ذرنا نكن مع القاعدين، استاذنك کی توضیح ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے یہاں اگرچہ 'واو' کا ترجمہ 'اور' سے کیا ہے لیکن تفسیر تقریباً اس انداز سے کی ہے کہ 'واو' بیانیہ بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، فعل آمنوا یہاں اپنے حقیقی اور کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی اپنے ایمان باللہ کا ثبوت دو جو یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کے لیے نکلو۔ البتہ دوسرے ٹکڑے کی وضاحت 'واو بیانیہ' کی روشنی میں نہیں کی گئی ہے[1]

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی وضاحت اسی انداز سے کی ہے۔ یعنی قرآن کی کسی صورت میں جب تنبیہ کی جاتی ہے کہ پوری طرح خلوص و پختگی سے ایمان لاؤ جس کا اثر یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ پیغمبرؐ کے ساتھ ہو کر خدا کے راستہ میں جہاد کریں، تو یہ منافقین جان چرانے لگتے ہیں اور ان میں سے استطاعت و مقدور والے بھی جھوٹے عذر تلاش کر اجازت طلب کرنے آتے ہیں کہ حضرت ہمیں یہیں مدینہ میں رہنے دیجیے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کی اس توضیح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے نزدیک 'واو' یہاں پر بیان کے لیے آیا ہے۔

البتہ اسی سورہ توبہ کی ایک دوسری آیت ہے جس کی تاویل میں علمار کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، اور یہ اختلاف صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ان علمار کے سامنے یہ اسلوب پورے طور پر سامنے نہیں رہا ہے۔ آیت کریمہ ہے:

"يا ايها النبى جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم۔"
(سورہ توبہ آیت ۷۳)

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں علمار کے اقوال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت حسنؒ، ضحاکؒ، ربیع بن انسؒ وغیرہ کا خیال ہے کہ کفار و مشرکین سے تو جہاد بالسیف کیا جائے گا مگر منافقین سے صرف جہاد باللسان پر اکتفا

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن ۴/۶۲۰

کیا جائے گا۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ کفار سے جنگ کی جائے گی۔ لیکن منافقین سے جہاد کا مطلب یہ ہے کہ ان پر حدود اللہ نافذ کی جائیں گی۔ یہ حضرت قتادہ کی رائے ہے اور ایک قول کے مطابق حضرت حسن کی بھی یہی رائے ہے[1]

یہاں دونوں اقوال کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب منافقین کا عطف کفار پر ہے تو کیوں ان کے ساتھ صرف جہاد باللسان پر اکتفا کیا جائے گا؟ یا کس دلیل کی بنا پر کفار کے ساتھ تو جنگ کی جائے گی اور منافقین پر صرف حدود اللہ نافذ کی جائیں گی؟

امام المفسرین ابن جریر طبریؒ ان سارے اقوال کو جمع کرنے کے بعد اپنے مخصوص طرز کے مطابق اپنی رائے اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

و اولی الاقوال فی تاویل ذٰلک بالصواب عندی ما قال ابن مسعود من أن اللہ امر النبیؐ من جہاد المنافقین بنحو الذی أمرہ بہ من جہاد المشرکین۔	ہمارے نزدیک اس آیت کی تاویل کے سلسلے میں سب سے زیادہ مناسب رائے وہی ہے جس کو حضرت ابن مسعودؓ نے اختیار فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کو حکم دیا ہے کہ آپ منافقین کے ساتھ بھی اسی طرح جنگ کریں جس طرح مشرکین سے کرتے ہیں۔

اس تاویل میں تو بلاشبہ وہ کمزوری نہیں ہے جو دوسرے مفسرین کی رایوں میں پائی جاتی ہے۔ البتہ اس میں سب سے بڑا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبیؐ نے منافقین کے ساتھ کون سی جنگ لڑی؟ کیا تاریخ اسلام میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے؟

مولانا فراہیؒ کے اصول کے مطابق اگر 'واو' کو بیانیہ مان لیا جائے تو آیت کا مفہوم بالکل صاف اور انتہائی واضح ہو جاتا ہے۔ اس روشنی میں ترجمہ ہوگا: "اے نبی! کفار یعنی

---

[1] دیکھئے زاد المسیر لابن الجوزی ۳/۴۶۹

منافقین سے جہاد کرو، یعنی ان کے ساتھ نہایت ہی سختی کے ساتھ پیش آؤ"۔ اس آیت کریمہ میں کفار و منافقین دو الگ الگ گروہ کا ذکر نہیں ہوا ہے بلکہ منافقین ہی کو ان کی مسلسل خیانتوں، غدّاریوں، بے وفائیوں اور فحش کلامی کی وجہ سے کافر کہا گیا۔ چنانچہ اگلی آیت میں خود اس کی وضاحت کردی گئی ہے:

یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر۔	یہ منافقین اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ انھوں نے کچھ نہیں کہا، حالانکہ انھوں نے کفر کا کلمہ کہا۔

اس اہم اسلوب کی وضاحت اسی سورہ کی ایک اور آیت سے ہوتی ہے۔ سورہ توبہ آیت ۱۲۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یا ایہا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ"۔

اس آیت کریمہ میں بھی 'یلونکم' من الکفار کی تاویل میں مفسرین کے کُل پانچ اقوال پائے جاتے ہیں:

۱۔ یلونکم من الکفار سے مراد رومی ہیں۔
۲۔ اس سے مراد قریظہ، نضیر اور خیبر کے یہود ہیں۔
۳۔ دیلم مراد ہیں۔
۴۔ عرب کے مشرکین ہیں۔
۵۔ اس میں کوئی گروہ مراد نہیں ہے بلکہ اقرب فالاقرب کے اصول پر تمام ہی مشرکین سے جنگ کی جائے گی[1]

یہاں بھی آیت کریمہ کی تاویل اگر مولانا فراہی کے اصول کی روشنی میں کی جائے تو آیت ۷۳ اور اس میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اسے اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو زاد المسیر ۳/۵۱۸

اس آیت میں من الکفار، الذین کا بیان ہے اور اس سے مراد منافقین ہیں۔ ولیجدوا فیکم غلظة، قاتلوا کی وضاحت ہے۔ جس طرح آیت ۷۳ میں جاھد کی تفسیر واغلظ علیھم سے کی گئی ہے۔ یلونکم کا لفظ معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں اور منافقین کے قریبی تعلق کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں مخلص اہل ایمان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم سب سے زیادہ منافقین سے چوکنے رہو، ان کا معاشرتی بائیکاٹ کرو، ان کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور ملاطفت کا رویہ نہ اپناؤ، کیونکہ یہ آستین کے سانپ ہیں۔ یہ رہتے تو ہیں تم سب سے بہت قریب لیکن ہمیشہ تمھیں نقصان پہونچانے کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

آیت کی یہ تاویل اس سورہ کے تفصیلی مضمون، سیاق وسباق اور نظم کلام سے بھی واضح طور پر مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

۲۔ حذف

اسالیب القرآن کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول حذف بھی ہے۔ عام طور پر مفسرین اور نحوی حضرات حذف کے قائل تو ہیں، لیکن بعض مواقع کو چھوڑ کر حذف کو کلام کی ایک خامی تصور کرتے ہیں۔

مولانا فراہی فرماتے ہیں کہ حذف کا قاعدہ تو دنیا کی تمام ہی زبانوں میں پایا جاتا ہے، البتہ عرب اپنی فطری ذہانت وطباعی کی وجہ سے حذف کے معاملے میں تمام اقوام سے ممتاز اور نمایاں ہیں، وہ کلام کے ان اجزا کو جنھیں مخاطب بادنی تامل سمجھ جائے بے تکلف حذف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کلام کا اعلیٰ معیار یہی ہے کہ وہ حشو وزوائد سے پاک ہو۔ مولانا فراہیؒ نے اس سلسلے میں کلام عرب اور قرآن مجید سے بہت سے شواہد پیش کیے ہیں جنھیں "التکمیل فی اصول التاویل" میں اجمالاً اور "اسالیب القرآن" اور "جمھرة البلاغة" میں تفصیلاً دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں پر چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس ضمن میں مولانا فراہی کے خیالات کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجائے:

۱۔ مولانا فراہیؒ اپنی انتہائی بلند پایہ کتاب "جمھرة البلاغة" میں اصول حذف پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومن الحذف الذی یتصل بالنحو ولم یھتد الیہ النحویون فمنہ الحذف من المعطوف بعض ما فی المعطوف علیہ وبالعکس"[1]

(حذف کی بعض مثالیں وہ ہیں جن کا تعلق علم نحو سے ہے لیکن عموماً نحویوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی، جیسے معطوف سے اس جزء کو حذف کر دینا جو معطوف علیہ میں ہو اور معطوف علیہ سے اس حصہ کو حذف کر دینا جو معطوف کے اندر موجود ہو۔)

اسے سمجھنے کے لیے آیت "یسبح الرعد بحمدہ والملائکة من خیفتہ" پیش نظر رکھیں۔ اس کے اندر مذکورہ اسلوب استعمال کیا گیا ہے۔ اسے کھول دیجئے تو عبارت یوں بنے گی، "یسبح الرعد بحمدہ من خیفتہ والملائکة بحمدہ من خیفتہ۔

۲۔ اسی طرح سورہ ہود کی یہ آیت بھی ہے:

"یانوح اھبط بسلام منا وبرکات علیک" (سورہ ہود ۴۸)

(اے نوح! اترو زمین پر ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ)

اس حذف کو کھولیے تو گویا پوری عبارت یوں بنے گی: "یانوح اھبط بسلام منا علیک وبرکات منا علیک"۔

ان دونوں آیتوں میں حذف کی مثالیں بالکل واضح ہیں لیکن مولانا فراہی کے علاوہ کسی نے بھی اس کی نشان دہی نہیں کی ہے۔ حالانکہ مولانا فراہی کے بقول یہ حذف کی مثالیں بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ذھب زید وعمر میں زید کے بعد ذھب فعل اور صلی زید وصام میں صام کا فاعل زید حذف ہو گیا۔[2]

مولانا فراہی نے حذف کے اصول اور مواقع کو سب سے زیادہ اپنی کتاب "اسالیب القرآن" میں بیان فرمایا ہے۔ تقریباً پندرہ اصول پیش کر کے اس اسلوب پر مفصل روشنی ڈالی

---

[1] جمھرة البلاغة ص ۶۸، [2] ایضاً

ہے۔ اس موقع پر اسالیب ہی سے ایک مثال پیش ہے تاکہ مولانا کا موقف اور زیادہ واضح ہو سکے:

منها حذف جانبين من المتقابلين لما دلّ عليه مقابله

كما قال تعالىٰ: "فاذاقها الله لباس الجوع والخوف". اى اذاقها

الله طعم الجوع والبسها لباس الخوف[1]

یہاں دونوں مقابل کے ایک ایک پہلو کو ایک دوسرے کی دلیل کے تحت حذف کر دیا گیا ہے۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کریمہ میں اس اسلوب کو استعارہ یا تشبیہ قرار دیا ہے[2]

امام فراہی اسے تشبیہ یا استعارہ نہیں بلکہ حذف کی ایک انتہائی اعلیٰ مثال قرار دیتے ہیں۔

مولانا فراہی کے ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل آیات پر غور کریں ـــــ

سورہ اعراف (۱۲) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قال یا ابلیس ما منعك أن لا تسجد اذ امرتك"۔

اس آیت میں عام طور پر مفسرین کو "ان لا تسجد" کے "لا" کے معنی کی تعیین میں بڑی دقتیں پیش آئی ہیں، کیونکہ یہی آیت سورہ جن (۷۵) میں بھی ہے۔ مگر وہاں ان لا تسجد" کے بجائے "ان تسجد" ہے۔ لہٰذا انھوں نے آسانی اسی میں سمجھی کہ سورہ اعراف میں "لا" کو زائد بنا دیا جائے۔ چنانچہ نحو کی تمام کتابوں میں یہاں پر "لا" کو زائد ہی مانا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں کسی بھی حرف یا لفظ کو زائد قرار دینے میں حد درجہ احتیاط برتنی چاہیے۔ خصوصاً اس لفظ یا حرف کو جسے زائد قرار دینے سے مثبت منفی، اور منفی مثبت ہو جاتا ہو۔ اس سے تو ہمارا پورا نظام دین ہی درہم برہم ہو جائے گا۔

مولانا فراہی کے اصول حذف کو سامنے رکھا جائے تو عبارت اس طرح ہوگی:

"ما منعك ان تسجد وامرتك ان لا تسجد اذ امرتك"۔

۲۔ اسی سے ملتی جلتی سورہ طٰہٰ کی بھی ایک آیت ہے۔ یہاں بھی عام طور پر مفسرین نے

---

[1] اسالیب القرآن، ص ۲۹

[2] ملاحظہ ہو کشاف ۲/۳۴۶ (بیروت)، فتح القدیر ۳/۲۰۰، دار الفکر بیروت ۱۹۸۳ء

لا کو زائد قرار دیا ہے:

"یاھارون ما منعك اذ رأیتھم ضلّوا ان لا تتبعن"۔

حذف کو کھولیے تو عبارت یہ بنتی ہے:

"یاھارون ما منعك اذ رأیتھم ضلّوا ان تتبعنی وأمرتك أن لا تتبعنی"۔

۳۔ نفی

قرآن کا ایک اہم اسلوب نفی بھی ہے۔ مولانا فراہی نے اس اسلوب کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں، جن میں سے ایک نفی الشیئ بلازمہ کی مثال بھی ہے۔ اس اسلوب کی تائید میں مولانا نے کلام عرب سے امرالقیس کے ایک شعر کا یہ مصرع نقل کیا ہے:

علی لاحب لا یھتدی بمنارہ

(اس راستے پر آہ و فغاں نہ کر جس کے میناروں کی روشنی سے رہنمائی نہیں حاصل کی جا سکتی ہے)

مطلب یہ ہے کہ یہاں کسی منارۂ نور کا وجود ہی نہیں ہے کہ اس سے روشنی حاصل کرنے کا سوال پیدا ہو۔ اس اسلوب کو اصطلاح میں نفی الشیئ بلازمہ کہتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن کریم کی اس آیت میں بھی ہے:

"قل أتنبئون الله بما لا یعلم فی السمٰوٰت ولا فی الارض"۔ (سورہ یونس)

اس آیت میں لا یعلم کا مفہوم یہ ہے کہ اس شے کا وجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو ضرور اس کا علم ہوتا۔

اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے اس اسلوب کی اس طرح وضاحت کی ہے: یہ نفی الشیئ بنفی لازمہ کے اسلوب پر ان کے فرضی سفارشیوں کی تردید ہے، یعنی ان کے فرضی سفارشیوں کا آسمان و زمین میں کوئی وجود ہوتا تو سب سے زیادہ ان سے باخبر تو خود اللہ تعالیٰ ہوتا جس کے وہ مقرب اور چہیتے ٹھہرائے جاتے ہیں۔ لیکن خدا کو تو کوئی ان کا پتہ نہیں ہے، بس یہی لوگ ان کا سراغ بھی دے رہے ہیں

اور یہی ان کو آسمان پر بھی چڑھا رہے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ رعد (۳۳) میں بھی ہے:

"وجعلوا للہ شرکاء قل سمّوھم أم تنبئونه بما لا یعلم
فی الارض أم بظاھر من القول"

(اور انھوں نے اللہ کے شریک ٹھہرائے ہیں کہ ان سے کہو کہ ذرا ان
کے نام تو لو، کیا تم اس کو ایسی چیز کا پتہ دے رہے ہو جس کے زمین میں وجود کا
خود اس کو علم نہیں یا یونہی ہوائی بات کر رہے ہو"[1]

مولانا فراہی کا پیش کردہ یہ اصول گو نادر نہیں ہے کیونکہ عموماً مفسّرین نے ان آیات کا مفہوم وہی بیان کیا ہے جو مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی نے بیان کیا ہے۔ البتہ مولانا فراہی اس کو کلام عرب اور قرآن مجید کے معروف اسلوب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے مفسّرین اس اسلوب کو کہیں کہیں نظر انداز کر جاتے ہیں، یا ان کا ذہن اس کی جانب منتقل نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے ان کی تاویل کوئی اور ہی رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران کی ایک آیت کریمہ:

"ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفراً لن
تقبل توبتھم"۔ (آل عمران ۹۰)

اس آیت کریمہ کے ٹکڑے "لن تقبل توبتھم" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ علامہ ابن الجوزی 'زاد المسیر' میں فرماتے ہیں:

وفی علة امتناع توبتھم اربعة اقوال:

احدھا: انھم ارتدوا وعزموا علیٰ اظھار التوبة لستر
احوالھم والکفر فی ضمائرھم۔ قاله ابن عباس
رضی اللہ تعالیٰ عنه۔

والثانی: انھم قوم تابوا من الذنوب ولم یتوبوا من

---

[1] تدبر قرآن ۴/ ۳۵ (فاران فاؤنڈیشن ۱۹۸۳ء)۔

الشرک۔ قاله ابو العالیة

والثالث: ان معناه لن تقبل توبتھم فیمن یحضرھم الموت
وھو قول الحسن وقتادة وعطاء الخراسانی والسدّی۔

والرابع: لن تقبل بعد الموت اذا ماتوا علی الکفر۔ قاله المجاھد"[1]

(ان کی توبہ قبول نہ ہونے کے سلسلے میں چار اقوال ہیں:

۱۔ ان کی توبہ اس لیے نہیں قبول کی جائے گی کہ انھوں نے ارتداد کی روش اختیار کی اور لوگوں کو صرف دکھانے کے لیے توبہ کا اظہار کیا۔ حالانکہ کفر ان کے دلوں میں راسخ ہو چکا تھا۔ یہ رائے حضرت ابن عباس کی ہے۔

۲۔ ابو العالیہ کہتے ہیں کہ چونکہ انھوں نے شرک کی آلائشوں میں رہتے ہوئے توبہ کی اس لیے ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

۳۔ حسن بصری، قتادہ، عطاء الخراسانی اور سدّی کا خیال ہے کہ جو لوگ موت کے فرشتے دیکھنے کے بعد توبہ کریں گے ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

۴۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ موت کے بعد ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ انھوں نے کفر کی حالت میں جان دی ہے۔

جیسا کہ مفسرین کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام کے تمام اس پر متفق ہیں کہ وہ لوگ توبہ کریں گے البتہ مختلف وجوہات کی بنیاد پر بارگاہِ خداوندی میں، ان کی توبہ شرف قبولیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

علامہ فراہیؒ نے نفی کا جو اسلوب کلام عرب اور قرآن مجید کی روشنی میں پیش فرمایا ہے، اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو مذکورہ آیت کا یہ ٹکڑا بھی 'نفی الشیئ بلازمه' کی مثال ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ چونکہ وہ کفر و انکار اور بغاوت و سرکشی کی حدوں کو تجاوز کر چکے ہیں اور اس میں آگے ہی بڑھتے جا رہے اب ان میں حق و انصاف اور ایمان و اسلام کی ذرہ برابر

---

[1] زاد المسیر ۱/ ۴۱۹

بھی رمق باقی نہیں ہے، اس لیے یہ ہرگز ہرگز توبہ کرکے اپنی زندگی سدھار ہی نہیں سکتے۔

"لن تقبل توبتھم" کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ ہرگز توبہ نہیں کریں گے کہ ان کی توبہ قبول کرنے کا سوال پیدا ہو۔

۴۔ تقدیم و تاخیر

مولانا فراہی قرآنی اسلوب کے اس پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فاعلم ان الترتیب یکون علی انحاء شتیٰ والشئ یقدم ویؤخر لوجوہ ولیس ان المقدم افضل فی کل موضع کما قال تعالیٰ: "فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات"۔ وتری المفسرین کثیرًا منھم یقولون ھٰذا تقدیم ماحقہ التاخیر وانی لا أحب ھٰذا القول، وکل موضع ذھبوا فیہ إلیٰ ھذا القول لم أجد امرًا خلاف ماحقہ۔[1]

یہ بات جان لو کہ ترتیب کلام کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ عبارت میں کسی جزء کا مقدم یا مؤخر ہونا مختلف وجوہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو چیز مقدم ہو لازمًا وہ ہر جگہ سب سے افضل ہی ہو۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے: "اُن سے کچھ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔" (فاطر ۳۲) لیکن تم اکثر مفسرین کو دیکھتے ہو کہ کہتے ہیں کہ عبارت میں اس کو مؤخر ہونا چاہیے تھا لیکن مقدم ہوگیا۔ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔ جہاں بھی انھوں نے اس طرح کا خیال ظاہر کیا ہے وہاں کسی امر کو میں نے اس کے برخلاف نہیں پایا جہاں اسے ہونا چاہیے۔

[1] اسالیب القرآن، ص ۴۹

دیگر ائمہ تفسیر بھی تقدیم و تاخیر کے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہیں کہ یہ مقدم تو ہوگیا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسے مؤخر ہونا چاہیے ــ ان بزرگوں کے نزدیک تقدیم و تاخیر گویا ایک طرح کا عیب ہے جس کو دور کرنے کے لیے یہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

لیکن علامہ فراہی بڑی بلند آہنگی سے فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو مقدم ہے اس کا مقدم ہونا حق ہے اور جو مؤخر ہے اسے مؤخر ہونا چاہیے۔ اگر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کردیا جائے تو کلام کی تاثیر اور زور بیان، عبارت کی رعنائی و دل کشی اور جملہ کا حسن و جمال غارت ہوکر رہ جائے گا۔

علامہ فراہیؒ نے اپنے اس نقطۂ نظر کو 'جمھرۃ البلاغۃ' میں اور تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ 'دلالۃ الوصل' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

ومن ھذا الباب مایراد فیہ الاتصال والفصل لاجل التصویر للواقعۃ ومثالہ فی قصۃ نوح فان دعاء نوح فی ابنہ وردہ من اللہ تعالیٰ واستغفار نوح والاستجابۃ، کل ذٰلک جاء متاخرا بعد تمام الواقعہ ولاشک أن سؤال نوح فی ابنہ کان قبل غرقہ وقبل استواء

اسی باب میں وہ اسلوب بھی داخل ہے جس میں اتصال اور انفصال کو پورے واقعہ کی تصویر کشی کے لیے لایا جاتا ہے، اس کی مثال حضرت نوحؑ کا قصہ ہے، کیونکہ حضرت نوحؑ کا بیٹے کے لیے دعا کرنا اور اس کا رد ہونا اور پھر ان کا اللہ سے نہایت عاجزی کے ساتھ طالب عفو ہونا اور اس کی طرف سے دعا کا قبول ہونا، یہ ساری باتیں واقعہ کی تکمیل کے بعد کی ہیں۔ حالانکہ اس میں شک نہیں کہ حضرت نوحؑ کی دعا بیٹے کی غرقابی اور جودی پہاڑ پر کشتی کے ٹکنے سے پہلے کی ہے۔ لیکن اگر واقعہ

الفلك على الجودى فلو وضع هذه الامور فى محلها الزمانى لتباعدت اجزاء التصوير ولم يتضح [1]

کی تفصیل میں ترتیب زمانی کا لحاظ کیا جاتا اور تقدیم وتاخیر سے کام نہ لیا جاتا تو تصویر کے اجزاء بکھر جاتے اور واقعہ کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے نہیں آسکتا تھا۔

مولانا آگے مزید فرماتے ہیں:

ثم انظر كيف ادمج القصه فى خمس آيات وجعل الخمس الباقية لدعاء نوح والبركة فجمع القصة فى آيات عشر وجعلها صورتين كاملتين احدهما بجنب الثانية فهذا هو الوجه الصحيح للتقديم والتاخير ثم من احسن البيان فيه ان هلاك ابنه صور بغتة وفى اسرع حالة ومع ذلك هو ابين تصويرا [2]

اس واقعہ پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ آیات میں پورے واقعہ کو سمیٹ دیا ہے۔ بقیہ پانچ آیات میں حضرت نوحؑ کی دعا اور اس کی برکتوں کا تذکرہ ہے۔ اس طرح دس آیات میں پورا واقعہ دو کامل ترین مناظر کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہ ہے تقدیم اور تاخیر کا صحیح رُخ۔ اور حسن بیان اور اعجاز قرآن کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی لمحہ میں نہایت سُرعت کے ساتھ بیٹے کی ہلاکت کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی واقعہ کی تصویر نہایت مکمل اور حد درجہ واضح اور روشن ہے۔

متقدمین اور متاخرین علماء میں شاید ہی کسی نے تقدیم وتاخیر کے اسلوب کو سامنے

[1] جہر البلاغۃ، ص ۶۴، [2] ایضاً

رکھ کر سورۂ ہود کی ان آیات کی اتنی جامع اتنی حکیمانہ اور اتنی موثر توضیح کی ہو۔

معاصرین میں صرف سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تصویر کے پہلے رُخ کو بڑی جامعیت، عمدگی، شگفتگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وانا بعد الآلاف السنين لنمسك انفاسنا ونحن نتابع السياق والهول يأخذنا كأننا نشهد المشهد وهى تجرى بهم فى موج كالجبال ونوح الوالد الملهوف يبعث بالنداء تلو النداء وابنه الفتى المغرور يأبى اجابة الدعاء والموجة الغامرة تحسم الموقف فى سرعة خاطفة وينتهى كل شئ وكان لم يكن دعاء ولا جواب۔

ہزاروں سال بعد بھی آج ہم جب کہ آیات کے سیاق پر مسلسل غور کر رہے ہیں تو دم بخود رہ جاتے ہیں اور دلوں پر دہشت طاری ہو جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے منظر سامنے آگیا ہے کشتی کہساروں کے مانند لہروں کے اندر اصحاب ایمان کو لے کر رواں دواں ہے۔ نوح، پدر غمزدہ آواز پر آواز دے رہے ہیں، فرزند جواں سال، متکبر و سرکش سُن کر جواب نہیں دے رہا ہے اور ادھر موج سرکش آناً فاناً ڈراپ سین کر دیتی ہے۔ پردے کی ہر چیز غائب ہو جاتی ہے، جیسے کوئی پُکار ہوئی نہ اسے قبول کرنے کا کوئی مسئلہ رہا۔

[1] فی ظلال القرآن ۴/۱۸۷